سَر سیّد اور اقبال:
ذہنی ارتباط کے خدوخال

○

طاہر مسعود

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

سید احمد خاں اور علامہ اقبال کا شمار ان عظیم شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے اپنے زمانے کے دھاروں کو سمجھا ' پرکھا اور قوم کی بھلائی اور بہتری کو پیش نظر رکھتے ہوئے قدم آگے بڑھائے ۔ بادی النظر میں دونوں شخصیات کے فکر و عمل میں تضاد کا گمان گزرتا ہے ' تاہم بنظر غائر دیکھا جائے تو اقبال اور سید احمد خان ' دونوں اپنے مقاصد اور فکر و عمل کے لحاظ سے بے حد قریب نظر آتے ہیں ۔ اقبال ' سید احمد خاں کے بعد وہ پہلے مفکر ہیں جنھوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ فرسودہ رسوم سے خلاصی حاصل کریں اور اسلام کے حقیقی اور عملی نظریات کو اپنائیں اور اپنی زندگیوں کو زمانے کے حالات اور تقاضوں کے مطابق ڈھالیں [1]۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں : " غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اقبال نے دراصل سرسید اور حالی کے کام کی تکمیل کی [2]۔ " لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس سے آگے بڑھتی ہے ' اور اقبال اس کام کی تکمیل ہی نہیں کرتے ' اس کو نئے مرحلے میں داخل کرتے اور نئے حالات کی روشنی میں نئی منزلوں سے بھی آشنا کرتے ہیں۔

اقبال اور سرسید کے ذہنی روابط کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس کی حدود مقرر کرنا خاصا دشوار مرحلہ ہے ۔ لیکن یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اقبال کے ذہنی استفادے کی کڑیاں ابتدا ہی سے علی گڑھ تحریک اور اس کے راہنماؤں کے افکار و نظریات سے وابستہ رہیں کیونکہ جس ماحول میں اقبال نے شعور کی آنکھ کھولی اور جس فضا میں انہوں نے ذہنی ارتقا کے ابتدائی مرحلے سر کیے ' اس پر سید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کے مختلف النوع اثرات غالب تھے ۔ پورے پنجاب کے باشعور مسلم طبقے کو اس فکری تحریک نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا ۔ یہ سید احمد خاں ہی کا عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کی نامور مسلم شخصیات کو اپنے مطمح نظر سے متاثر کیا اور انہیں ساتھ لے کر ملت اسلامیہ کی تعمیر و تشکیل کے لیے مشغول ہو گئے ۔ سید احمد خاں نے دسمبر ۱۸۷۳ کو جب پنجاب کا پہلا دورہ کیا تو ان کے پر جوش استقبال سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ سرزمین پنجاب کی ذہنی

فضا ان کی تحریک کے موافق تھی ۔ اس کی ایک سیاسی وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۸۴۹ میں جب یہ علاقہ انگریزوں کی عملداری میں آیا اور سکھ حکومت کے دور ظلم و بربریت کا خاتمہ ہوا تو یہاں کے مسلمانوں نے آسودگی و طمانیت پائی ۔ بقول افتخار احمد صدیقی " یہ نیا دور ان کے لیے یکسر رحمت نہ سہی تو کم تر لعنت ضرور تھا [۳] " اس لیے یہاں کے مسلمانوں کے دلوں میں انگریزی اقتدار اور انگریزی تعلیم اور زبان کے بارے میں نفرت آمیز جذبات نہیں تھے ۔ لہٰذا سید احمد خاں کے دورے کے نتیجے میں اہل پنجاب میں بیداری کی لہر اتنی سرعت سے آئی کہ جب سید احمد خاں نے ۱۸۸۴ میں پنجاب کا دوسری بار دورہ کیا تو لاہور ' لدھیانہ ' جالندھر ' امرتسر اور گجرات وغیرہ میں اسلامی رفاہی انجمنیں قائم ہو چکی تھیں ' یعنی مسلمانان پنجاب نے سید احمد خاں کی تحریک کے مقاصد کو کھلے دل سے تسلیم کیا اور جدید زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ان کے ہمنوا بن گئے ۔ یہی وجہ ہے کہ اہل پنجاب سید احمد خاں کی مخالفت پر کمربستہ نہیں ہوئے اور نہ یہاں کے علمائے کرام نے سید احمد خاں کے عقائد اور ان کے اجتہادی نظریات کے خلاف محاذ آرائی اور فتوے بازی کی ۔ مولانا حالی سرزمین پنجاب میں سید احمد خاں کے نظریات کے اثر و نفوذ کا حال بڑے دلکش پیرائے میں بیان کرتے ہیں :

> " ۔۔۔۔پنجاب کے مسلمان ' جنہوں نے برٹش گورنمنٹ کی بدولت ایک مدت کے بعد نئی زندگی حاصل کی تھی ' اور اس لیے انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کو خیر مقدم کہنے کے لیے تیار بیٹھے تھے ' سرسید کی منادی پر وہ اس طرح دوڑے جیسے پیاسا پانی پر دوڑتا ہے ۔ انہوں نے صرف یہی نہیں کہ مدرستہ العلوم کو مالی مدد پہنچائی ' بلکہ سچ یہ ہے کہ سرسید اور ان کے کاموں کی کسی صوبہ نے عام طور پر ایسی قدر نہیں کی جیسی پنجاب والوں نے کی ۔ کالج میں انہوں نے ہر ایک صوبہ سے زیادہ لڑکے تعلیم کے لیے بھیجے ' ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انہوں نے سب سے زیادہ دلچسپی ظاہر کی ' سرسید کی ہر قسم کی اصلاحیں انہوں نے سب سے زیادہ قبول کیں اور قوم کی بھلائی کے کاموں میں سب سے بڑھ کر انہوں نے سرسید کی تقلید اختیار کی ۔۔۔۔۔ انہوں نے ہندوستان کے اور حصوں کی طرح سرسید کو مسلمانوں کی صرف دنیوی ترقی کا خواستگار ' مگر دین کا مخرب نہیں ٹھہرایا بلکہ ان کو دنیا اور دین ' دونوں کا سچا خیر خواہ اور خیر اندیش سمجھا ۔ حق یہ ہے کہ قومی خدمات کی داد جو قوم کی طرف سے سرسید کو ملنی چاہیے تھی ' اس کا حق کے مسلمانوں کے برابر کسی صوبے سے ادا نہیں ہو سکا [۴] ۔ "

علامہ اقبال نے مسلمانانِ پنجاب کی ذہنی بیداری کے عمل اور علمی و عملی سرگرمیوں میں شد و مد سے حصہ لینے کو ان کی فطری خوبی پر محمول کیا ہے ۔ اپنے ایک خط میں انہوں نے مسلمانانِ پنجاب کی اس خصوصیت کا ذکر یوں کیا ہے : " ۔۔۔ یہاں کے لوگوں میں اثر قبول کرنے کا مادہ زیادہ ہے ۔ سادہ دل صحرائیوں کی طرح ان میں ہر قسم کی باتیں سننے اور ان سے متاثر ہو کر ان پر عمل کرنے کی صلاحیت اور مقامات سے بڑھ کر ہے [۵]۔" یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ خود اقبال بھی اس رائے سے مستثنیٰ نہیں ۔ سیالکوٹ سے تعلق کی بنا پر وہ بھی اہل پنجاب یا مسلمانانِ پنجاب ہی کے زمرے میں آتے ہیں ۔

سیالکوٹ میں اقبال کا طالب علمی کا زمانہ شمس العلما سید میر حسن کے زیر شفقت گزرا جو ان کے استاد ہی نہیں ، محسن و ہمدرد بھی تھے ۔ مولوی میر حسن کا سید احمد خاں کی تحریک اور مقاصد سے بڑا گہرا تعلق تھا ۔ یوں سمجھ لیں کہ پنجاب میں سید میر حسن کی حیثیت علی گڑھ تحریک کے ایک نمائندے جیسی تھی ۔ سید احمد خاں ان پر مکمل بھروسا کرتے تھے ۔ سید احمد خاں سے ان کی ملاقات تو دورۂ پنجاب کے موقع پر ہوئی لیکن اس سے پیشتر وہ سید احمد خاں کے نظریات و مقاصد سے اچھی طرح آگاہ ہو چکے تھے ۔ علمی بصیرت و آگہی ، وسیع المشربی اور روشن خیالی سے متصف ہونے کی بنا پر سید احمد خاں کے نظریات و تصورات سے گہری وابستگی و دلچسپی رکھتے تھے ۔ ۱۸۷۷ میں جب علی گڑھ کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو اس تقریب میں سید میر حسن بھی شریک تھے [۶]، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ممبر تھے اور اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے ۔ سید احمد خاں سے ان کے ذاتی مراسم کا اندازہ ان دس (۱۰) خطوط سے ہوتا ہے جو مکتوبات سرسید میں " بنام مولانا میر حسن " شامل ہیں ۔ ان سے مترشح ہے کہ انہیں سید احمد خاں کی تحریروں کا اس قدر لپکا تھا کہ تصانیف و رسائل سید احمد خاں کی خریداری کے لیے پیشگی چندہ بھجوا دیا کرتے تھے ، خصوصاً " سید احمد خاں کی " تفسیر القرآن " کے بارے میں استفسارات کرنا ، اس کی مختلف جلدوں کی طباعت کے مراحل سے باخبر رہنا اور اشاعت کا انتظار و اشتیاق اور تقاضوں پر تقاضے کرنا ان کی دلچسپی کے واضح ثبوت ہیں ۔ ان خطوط میں ۷ ۔ مارچ ۱۸۹۶ کا ایک خط ایسا بھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ " تہذیب الاخلاق " کے ہر نئے شمارے کے لیے ایک ماہ تک انتظار کرنا ان پر گراں گزرتا تھا ، اس لیے انہوں نے سید احمد خاں کو مشورہ دیا کہ وہ " تہذیب الاخلاق " کو مہینے میں ایک مرتبہ کے بجائے دو مرتبہ شائع کیا کریں جس کے جواب میں سید احمد خاں نے مالی مشکلات اور تصنیفی مصروفیات کی مجبوریاں بیان کرتے ہوئے معذوری ظاہر کی [۷]۔

شمس العلما سید میر حسن سے اقبال کی قلبی وابستگی اور شیفتگی کا عالم یہ تھا کہ خود اپنے آپ کو وہ ان کی زندہ تصنیف گردانتے تھے اور ان سے طالب علمانہ و نیاز مندانہ

تعلق کو باعث فخر خیال کرتے تھے :

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں ہیں وہ کچھ بن کے نکلے ہیں[۸]

پھر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان جانے سے پہلے حضرت نظام الدین اولیا " کی درگاہ" پر حاضر ہو کر " التجائے مسافر" میں اپنے استاد کے بارے میں عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں :

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو[۹]

میر حسن سے تعلق خاطر کی بنا پر اقبال نے اس وقت تک خود کو " سر" کے خطاب کے قابل نہیں سمجھا جب تک کہ ان کے محترم استاد کو شمس العلما کا خطاب نہیں مل گیا۔ یہ تھی احترام و محبت کی وہ فضا جو استاد اور شاگرد کے درمیان موجود تھی ۔ اقبال اسکول سے لے کر کالج کی سطح تک مولانا سید میر حسن کے پاس زیر تعلیم رہے اور معمول تھا کہ اسکول اور کالج کے بعد شام کو ان کے گھر پر بھی تعلیم حاصل کرنے جایا کرتے تھے ' یعنی زیادہ تر وقت سید میر حسن کی خدمت میں گزارتے تھے ۔ لہٰذا یہ لازم ہے کہ سید احمد خاں کے فکری دھارے میر حسن کے فیض صحبت سے شعوری و لا شعوری طور پر فکر اقبال کی تعمیر و تشکیل میں معاون و مدد گار رہے ہوں ۔

برصغیر کے روشن خیال ' با شعور اور ہوش مند مسلمانوں کی طرح اقبال بھی سید احمد کے مداح و عقیدت مند تھے ۔ جب سید احمد خاں کا انتقال مارچ ۱۸۹۸ میں ہوا تو برصغیر کے تمام مسلمانوں کی طرح اقبال نے بھی قومی اور علمی نقصان کے حامل اس سانحے کو شدت سے محسوس کیا ۔ ان دنوں اقبال ایم ۔ اے کے طالب علم تھے اور لاہور سے سیالکوٹ گئے ہوئے تھے ۔ سید احمد خاں کی وفات کا تار سید میر حسن کو ملا تو وہ کالج جا رہے تھے ۔ راستے میں اقبال سے ملاقات ہوئی تو کہا کہ سید احمد خاں وفات پا گئے ہیں ' مادۂ تاریخ کے لیے فکر کرنا ' میں بھی کوشش کرتا ہوں ۔ اقبال ' سید احمد خاں کی وفات حسرت آیات سے خود بھی متاثر تھے ' استاد کی ہدایت نے اس تاثر کو اور بھی گہرا کر دیا ۔ استاد اور شاگرد دونوں نے تاریخیں نکالیں [۱۰] ۔ مادہ ہائے تاریخ کے انتخاب کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی ' اس نے مولوی سید میر حسن اور اقبال کی تاریخوں کو بہترین قرار دیا ۔ شمس

العلما سید میر حسن کی نکالی ہوئی تاریخ وفات یہ تھی :

غفرلہ (۱۳۱۵ھ)

(اس کی مغفرت کی گئی)

اقبال نے قرآن پاک کی اس آیت سے تاریخ نکالی :

انی متوفیک ورافعک الی و مطھرک (۱۳۱۵ھ)

یہ آیت مبارکہ سورہ آل عمران کی ہے ۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے خداوند قدوس کی خوشنودی کا اظہار ہے ۔ یوں اقبال نے اس آیت سے تاریخ نکال کر سید احمد خاں کی شخصیت کی عظمت و بزرگی کا نہایت خوبصورت اعتراف کیا" ۔ سیالکوٹ کے بعض علما نے اس پر اعتراض کیا کہ جو آیت مبارکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ' اس سے سید احمد خاں کی تاریخ وفات نکالی ہے ۔ شیخ اعجاز احمد کا بیان ہے کہ جب علامہ اقبال تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے دوسرا مادۂ تاریخ نکالا :

کانہ مسیح لکل مراض ط[۱۲] (۱۳۱۵ھ)

لہٰذا یہ امر یقینی ہے کہ اقبال اپنے استاد میر حسن کے ذریعے اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں ہی سید احمد خاں کی تحریک اور اس تحریک کے مقاصد سے واقف ہو چکے تھے ۔ علی گڑھ سے اثر قبول کرنے میں اقبال کے محبوب استاد ٹی ۔ ڈبلیو آرنلڈ بھی جن سے گورنمنٹ کالج لاہور میں اقبال ذہنی طور پر قریب رہے ' بہت معاون رہے ہوں گے ۔ بانگ درا کی نظم " نالہ فراق " اور فلسفہ عجم " کے انتساب سے علامہ کی پروفیسر آرنلڈ سے جذباتی وابستگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

اقبال نے سید احمد خاں کے افکار کی عکاسی کرتے ہوئے جنوری ۱۹۰۳ میں ایک نظم "سید کی لوح تربت "لکھی ۔ یہ ایک ایسی نظم ہے جس کے حوالے سے سید احمد خاں کے دبستان فکر سے اقبال کے روابط کو کسی حد تک متعین کیا جا سکتا ہے ۔ تاہم اس سلسلے میں نظم کے ابتدائی متن کو سامنے رکھنا ہو گا [۱۳] ۔ اس نظم میں وہ پر درد و پر تاثیر صدائیں ہیں جو اقبال نے تخیل کے کانوں سے سید مرحوم کی قبر سے سنیں اور ذہن و فکر کو جلا بخشی ۔ یہی وہ نقطہ اتصال ہے جہاں اقبال کے رجحانات و میلانات تخیل کا روپ دھارتے ہوئے فکر سید احمد خاں کی ہم نوائی میں تسکین پاتے ہیں ۔ اس نظم میں دین و دنیا ' دونوں کے حوالے سے ' ایک متوازن رویہ اپنانے کی تلقین ' اور دوسرے لفظوں میں انتہا پسندی سے گریز کی تاکید :

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں[۱۴]

فرقہ بندی و تفرقہ بازی کے ہنگامے سے پرہیز :

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں[۱۵]

زمانے کے تغیرات کو سمجھ کر نئے زمانے کے نئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی ہدایت:

محفل نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ[۱۶]

بحیثیت مدبر، سیاسی امور میں دلیری، بے باکی و حق گوئی کی تلقین:

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا
ہے دلیری دست ارباب سیاست کا عصا
عرض مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوت فرماں روا کے سامنے بیباک ہے[۱۷]

قوم کی ترقی و خوشحالی کے لیے جان توڑ کوشش کرتے ہوئے امر ہو جانا اور اس راستے میں پیش آنے والی رکاوٹوں سے گھبرانے کے بجائے عزم و حوصلہ پانے کی تلقین:

دیکھ آواز ملامت سے نہ گھبرانا ذرا
عشق کے شعلے کو بھڑکاتی ہے یہ بن کر ہوا
وہ شجر ہے عشق اخواں، زندگی ہے جس کا پھل
قوم کے عاشق کو چھو سکتا نہیں دست اجل[۱۸]

اس نظم کا بنیادی تصور یا حقیقی پیغام فارسی شعر میں نہایت خوبی سے بیان ہوا ہے کہ عالم گیر اخوت و محبت کا شمار اسلام کے بنیادی نصب العین کا حصہ ہے۔ اسی نصب العین کی بدولت ملت اسلامیہ نے وہ نمایاں حیثیت اور بلند مقام پایا ہے کہ وہ "خیر الامم" بن گئی:

چوں ز مینائے محبت خوردہ بودم بادۂ
تا ثریا رفت ایں قوم نہ خاک افتادۂ[۱۹]

اسلام باہمی اخوت کے رشتے سے ہماری شیرازہ بندی کرتا ہے اور تمام قوموں کے ساتھ فراخ دلی، بلند حوصلگی اور رواداری کے سلوک کا درس دیتا ہے۔ غیر اقوام سے متعصبانہ رویہ رکھنا یا انہیں اچھا نہ سمجھنا، مسلمانوں کا وتیرہ نہیں، نہ ہی دین کی کوئی خدمت ہے:

گالیاں دینا کسی کو دین کی خدمت نہیں
یہ تعصب کوئی مفتاح در جنت نہیں[۲۰]

یہ سب وہ رویے ہیں جن کا اثر و نفوذ کلام اقبال میں آغاز سے لے کر انجام تک کسی نہ کسی

صورت میں نظر آتا ہے جبکہ اردو ادب کے بعض نقاد اس نظم کو اقبال کی ابتدائی شاعری کا نمونہ قرار دیتے ہوئے نظرانداز کر دینا چاہتے ہیں ۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں :

" --- یہ نظم ۱۹۰۳ میں لکھی گئی ہے ۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں ' یہ اقبال کی شاعری کا دور اول ہے اور انہوں نے جو کچھ اس زمانے میں لکھا ہے ' بعد میں بہت کچھ اس کے برعکس تحریر کیا ہے ---------- " سید کی لوح تربت " بھی اسی قسم کی نظم ہے جسے غیر ضروری اہمیت نہیں دینی چاہیے [۲۱] "۔

خد و خال اقبال کے مصنف محمد امین زبیری بھی اس نظم کی اہمیت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں [۲۲] ۔ اقبال کی فکر کو سمجھنے میں کجی ہمیشہ اس وقت سامنے آتی ہے جب دور اول اور بعد کے افکار کو برعکس تصور کیا جاتا ہے ۔ در حقیقت جن افکار کو برعکس سمجھا جاتا ہے ' وہ ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ارتقا یافتہ صورت ہیں ۔ ہر صاحب فکر کی سوچ میں اولاً کئی رنگ پھوٹتے ہیں لیکن وقت ' حالات اور زمانے کے ساتھ ساتھ ان میں سے کچھ رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں ' کچھ گہرے ہو جاتے ہیں اور بعض مختلف شیڈز اختیار کر لیتے ہیں ۔ اقبال کی فکر کا بھی یہی عالم ہے ۔ اولین دور کے بیشتر کلام کو کلام مابعد کے برعکس تسلیم کر لیا جائے تو کیا ضروری ہے کہ یہ نظم بھی اسی ذیل میں آئے گی یا کیا لازم ہے کہ اس نظم میں پیش کردہ تمام افکار ' افکار مابعد سے کلی طور پر مختلف ہوں ۔ " سید کی لوح تربت " کو اس لیے غیر معمولی اہمیت دینی چاہیے کہ اقبال ' سید احمد خاں کے نہ صرف دل سے قدر دان تھے بلکہ ان کے لیے ایک خاص عقیدت کا جذبہ ابتدائی عمر سے ہی دل میں رکھتے تھے [۲۳] ' اس لیے یہ نظم افکار اقبال کی روح کو سمجھنے کے لیے ایک اہم ابتدائی اشارہ بن جاتی ہے ۔

واضح رہے کہ تاریخی ' معاشرتی ' معاشی ' عمرانی ' ثقافتی ' تہذیبی اور سب سے بڑھ کر سیاسی حالات کے زیر اثر ملکی سطح پر بھی تغیرات رونما ہو رہے تھے ' اور بین الاقوامی سطح پر بھی جن سے اثرات قبول نہ کرنا غیر فطری امر تھا ' نیز یہ کہ ۱۹۰۳ سے لے کر ۱۹۰۸ تک اقبال کے ذہنی افق پر مسلسل توسیع ہوتی رہی ' لیکن اسلامی مابعد الطبیعیات کی اساس جوں کی توں ہی رہی بلکہ اس میں زیادہ استحکام پیدا ہوتا گیا ۔ اس ضمن میں آرنلڈ اور سر عبدالقادر سے اقبال کے مابین مکالموں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جو اردو شعر و ادب کے حوالے سے ہیئت اور مواد سے بلا واسطہ اور بالواسطہ متعلق ہیں اور اقبال کی متخیلہ میں فکری اور نظریاتی ارتقا کا پتہ دیتے ہیں ' تاہم قومی اور ملی نظریات اور زیادہ پختہ صورت میں پیش نظر رہے ۔ یہ وہی قومی اور ملی احساسات و جذبات اور نظریات ہیں جن کی داغ بیل سرسید احمد اور حالی نے رکھی تھی ۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اس موضوع پر مزید رقمطراز ہیں کہ :

" علامہ اقبال کے کلام نظم و نثر میں سرسید کا ذکر بہت کم آیا ہے ' بلکہ صرف ایک ہی نظم میں ان کا تفصیلی ذکر ہوا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علامہ اقبال نے ۱۹۰۸ کے بعد کچھ لکھا ہے ' وہ ان کا اصل سرمایہ حیات ہے اور وہی ان کے کلام کا جزو غالب ہے اور اسی کی وجہ سے انہیں اس قدر اہمیت دی جاتی ہے ۔ اس تمام حصے کی چھان بین کریں تو سید احمد خاں کا کہیں ذکر تک نہیں ملے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تلاش بسیار کے بعد میں سید احمد خاں کا بالکل سرسری ذکر علامہ کی تحریروں میں دو تین جگہ دیکھ سکا ہوں [۲۴] ۔ اولاً " یہ کہ فکری اخذ و استفادہ نام لیے بغیر بھی ممکن ہے ' ثانیاً " اقبال کے کلام نظم و نثر کی ضخامت کو مد نظر رکھا جائے تو سید احمد خاں کا ذکر واقعی کم ہے ' تاہم اہمیت و وقعت کے اعتبار سے کسی طرح کم نہیں ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سید احمد خاں کی عظیم الشان شخصیت اقبال کے دل و دماغ کو مسحور کرتی تھی ۔ یہی سبب ہے کہ اقبال ' سید احمد خاں کی آوازیں تخیل کے کانوں سے سنتے ' محسوس کرتے اور خوابوں میں ان سے ہم کلام ہوتے ۔ مثنوی " پس چہ باید کرد اے اقوام شرق " کے اختتام پر اقبال نے " در حضور رسالت مآب ﷺ " ایک عرضداشت پیش کی ہے ۔ اس کے آغاز میں اقبال نے بہ زبان فارسی ایک نوٹ دیا ہے کہ " شب سہ اپریل ۱۹۳۶ کہ در دار الاقبال بھوپال بودم سید احمد خاں رحمتہ اللہ علیہ را در خواب دیدم فرمود ند کہ از علامت خویش در حضور رسالت مآب ﷺ عرض کن [۲۵] " ۔ پروفیسر الیاس برنی کے نام ۱۳ جون ۱۹۳۶ کے خط میں اسی سلسلے میں لکھتے ہیں کہ " ۳ اپریل کی شب ۳ بجے کے قریب (میں اس شب بھوپال میں تھا) میں نے سرسید علیہ الرحمتہ کو خواب میں دیکھا ۔ پوچھتے ہیں تم کب سے بیمار ہو ۔ میں نے عرض کیا دو سال سے اوپر مدت گزر گئی ۔ فرمایا ' حضور رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں عرض کرو ۔ میری آنکھ اس وقت کھل گئی ' اور اس عرضداشت کے چند شعر جواب طویل ہو گئی ہے ' میری زبان پر جاری ہو گئے ۔ ان شا اللہ ایک مثنوی فارسی " پس چہ باید کرد اے اقوام شرق " نام کے ساتھ عرضداشت شائع ہو گی [۲۶] " ۔ سر راس مسعود کے نام ۲۹ جون ۱۹۳۶ کے خط میں بھی اس خواب کا حال یوں بیان کیا ہے :

> " ۳ ۔ اپریل کی شب کو جب میں بھوپال میں تھا ' میں نے تمہارے دادا رحمتہ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا ۔ مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآب کی خدمت میں عرض کر ۔ میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرضداشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے [۲۷] ۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اقبال نے تین مقامات پر سید احمد خاں کو " رحمتہ اللہ علیہ " کہہ کر پکارا ہے ۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سید احمد خاں سے اقبال کا ذہنی و

قلبی تعلق کس سطح کا تھا ۔۔۔۔۔۔ مذکورہ خواب کی مختلف جہتیں ہیں جسے مابعد الطبیعیاتی لحاظ سے بشارت قرار دیا جا سکتا ہے ' دوسری نفسیاتی جہت کو فرائڈین اور شعور اور لا شعور کے ذیل میں دیکھا جا سکتا ہے ۔ ژونگ کے آرکیٹائپل (Archetypal) نظریات کے ضمن میں رکھ کر اجتماعی لا شعور کے حوالے سے تجزیہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے ' نیز ہمارے اس مقالے کے نفس موضوع کے لحاظ سے اس امر کو تقویت پہنچتی ہے کہ علامہ کی سرسید احمد خاں سے جو فکری ' عقلی اور جذباتی وابستگی اول اول قائم ہوئی تھی ' اس میں تخفیف اور کمی کے بجائے ہمیشہ اضافہ ہوتا رہا اور یہ ذہنی تعلق ہر زمانے میں قائم رہا ۔

اقبال نے سید احمد خاں کا جہاں بھی ذکر کیا ہے ' اس سے ایک صالح فکری شخصیت کا ہیولی ابھر کر سامنے آتا ہے ۔ یوں لگتا ہے کہ اقبال ' ان کے فکر و نظر ' علمی بصیرت ' مخصوص حالات میں ان کے کردار و موقف اور دلی کرب کو سمجھ کر ان کی عظمت کے قائل ہوئے تھے ' محض جذباتی لگاؤ کے سبب نہیں ۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۸ میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی سے خطاب کرتے ہوئے علامہ نے فرمایا :

> " میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سر سید احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں کے لیے جو راہ عمل اختیار کی تھی ' وہ صحیح تھی ' اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے "[۲۸] ۔

کانگریسی خیال کے علما کے مقابلے میں سید احمد خاں کی سیاسی بصیرت اور معاملہ فہمی کا ذکر کرتے ہوئے ۷ مارچ ۱۹۳۸ کو فرمایا کہ ان (علما) میں سوجھ بوجھ اور سیاسی بصیرت کا فقدان ہے ۔ وہ نہیں جانتے کہ ہندو ارباب سیاست آزادی اور شہنشاہیت دشمنی کے پردے میں کیا کھیل کھیل رہے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ البتہ سرسید احمد اس نکتے کو خوب سمجھے ۔ انہوں نے نہایت صحیح کہا کہ مجھے ایسے آئین سے کوئی دلچسپی نہیں جس میں میرا کوئی حصہ نہیں یا اگر کہنے کو ہے بھی تو اپنا حق منوا سکوں نہ اسے چھیننے سے روک سکوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سرسید نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہم کانگریس سے الگ رہیں ۔ کانگریس میں شرکت کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم نے اس فرضی اور خیالی ' یعنی ہندوستانی قومیت کا وجود تسلیم کر لیا ہے جو دراصل ہندو قومیت ہی کا ایک دوسرا نام ہے "[۲۹] ۔

سرسید نے مفروضات کے رومانی ہیولے کو مسترد کر کے فکر و عمل کی سرزمین پر قائم و دائم حقیقت کو عقلی روشنی میں پرکھ کر قبول کیا تھا جس پر علامہ اقبال نے صاد بھی کیا اور اپنے نظریہ پاکستان کی بنیاد رکھی ' لہٰذا سرسید احمد خاں کی شخصیت اور ان کے نظریات اقبال کی فکر کا دائمی حصہ رہے اور اس ارتقا کا عمل جاری رہا ۔ سید احمد خاں کی اعلیٰ ظرفی ' دور اندیشی اور ان کی تحریک کے کردار کو سراہتے ہوئے علامہ نے اسی نشست میں فرمایا :

"سرسید احمد خاں کی رائے نہایت صائب تھی ۔ سرسید کو علما نے کیا کچھ نہیں کہا : کافر، ملحد، کرسٹان، لیکن سرسید کا کتنا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اس خطرے کو بھانپ لیا جو بحیثیت ایک قوم مسلمانوں کو در پیش تھا ۔ انہوں نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت پر زور دیا ۔ وہ جب تعلیم پر زور دیتے، تہذیب و تمدن میں آگے بڑھنے کی تاکید کرتے، تب بھی ان کا کہنا یہی تھا کہ ہم اپنا جداگانہ ملی وجود ہر حالت میں قائم رکھیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ یہی وجہ ہے علی گڑھ کی بدولت ایک عام بیداری پیدا ہوئی اور قوم کے قوائے علم و عمل حرکت میں آئے ۔ یہ گویا ہماری نشاۃ ثانیہ ہی کی ایک تحریک تھی"[۳۰]۔

اسی مقام پر ایک نکتے کا اور انکشاف ہوتا ہے کہ سید احمد اور علامہ اقبال دونوں، مسلمانوں میں افتراق و انتشار اور فقہی جھگڑوں کے بجائے، یعنی فرقہ واریت کے بجائے ملی اتحاد دیکھنے کے خواہاں تھے ۔ سید احمد نے تو عملاً "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سب فرقوں کے لیے ایک مسجد قائم کر کے نماز ادا کرنے کی دعوت دی اور ہر فرقے کی دینیات کو لازمی قرار دے دیا، گویا اجتہاد کے دروازے کھول دیے ۔ تنگ دلی، تنگ نظری اور فقہی ملائیت کا سد باب کر دیا ۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو مسلم دینیات کے مطالعے کے سلسلے میں اپنی رائے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرنا مقصود ہے تو فکر دینی کو از سر نو تعمیر کرنا قطعاً" لازمی ہے ۔ اور بہت سے مسئلوں کی طرح اس مسئلہ میں بھی سرسید احمد خاں کی دور رس نگاہ کم و بیش پیشگوئیانہ تھی"[۳۱]۔

"Islam and Qadianism" میں سید احمد خاں کی مذہبی و اسلامی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے انہیں بڑے اچھے الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے :

He was the first modern Muslim to catch a glimpse of the positive character of the age which was coming. The remedy for the ills of Islam proposed by him, as by Mufti Alam jan in Russia, was modern education. But the real greatness of the man consists in the fact that he was the first Indian Muslim who felt the need of a fresh orientation of Islam and worked for it . We may differ from his religious views, but there can be no denying the fact that his sensitive soul was the first to re-act to the

modern age [32].

سید احمد خاں کی تکفیر کرنے والے علما کو صراط مستقیم دکھاتے ہوئے' استدلالی انداز میں کہتے ہیں:

"علمائے سہارن پور نے یہ نہیں سوچا کہ سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی' تہذیب الاخلاق نکالا' علی گڑھ کالج قائم کیا یا مسائل الٰہیات پر قلم اٹھایا تو اس سے ان کا مدعا کیا تھا: یہی کہ مسلمانوں کو اپنی وحدت کا شعور ہو [۳۳]"۔

مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کو اپنے ایک خط میں علمائے سو کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"آپ نے ٹھیک فرمایا ہے۔ پیشہ ور مولویوں کا اثر سرسید احمد خاں کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا' مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹکل فتووں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً" کسی کو نہیں ہوا [۳۴]"۔

سرسید احمد خاں کی صفات اور کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالتے ہوئے ۴ جون ۱۹۳۸ کو انہوں نے کہا:

"سرسید کی ذات بڑی بلند تھی' بڑی ہمہ گیر۔ افسوس ہے مسلمانوں کو پھر ویسا کوئی رہنما نہیں ملا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ غلامی اور محکومی بہت بڑی لعنت ہے۔ حکومت اور اقتدار ایک سحر ہے جس سے محکوموں کے دل و دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں۔ علی گڑھ کی کتنی بڑی خوبی ہے کہ اس نے ہمارے دل و دماغ کو محفوظ رکھا۔ یا پھر یوں کہنا چاہیے کہ اسلام میں زندگی کی بے پناہ قوت ہے۔ یہ قوت علی گڑھ میں بھی کار فرما تھی۔ لہٰذا باوجود مغربی تعلیم کے مسلمانوں کا جذبہ ملی قائم اور برقرار رہا [۳۵]"۔

اپنے دور کے مخصوص حالات کی مناسبت سے سید احمد خاں نے جو مصلحت پسندانہ پالیسی اپنا رکھی تھی' اس کے متنازعہ پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے علامہ نے فرمایا:

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ سرسید کے خیالات اور ان خیالات کے ماتحت انہوں نے جو اقدامات کیے' وہ تنقید سے بالاتر نہیں' ان میں گفتگو کی گنجائش ہے۔ لیکن یہ اقدامات ضروری تھے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ ایسا کوئی اقدام کیا جاتا جس سے مسلمانوں کی توجہ وقت کے تقاضوں اور مستقبل کی طرف منعطف ہوتی۔ سرسید کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے یہ اقدام کیا۔ یہ اقدام بہرحال ضروری تھا۔ یہی بات ہے جو ان

کے نکتہ چینوں کی سمجھ میں نہیں آئی [۳۶]"۔

سید احمد خاں کی ذات و صفات اور ان کے کارناموں سے اقبال اس درجہ متاثر تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کی روح کو بھی " جاوید نامہ " میں جمع کر دیں لیکن انہیں خیال نہ رہا [۳۷] سید احمد خاں (۱۸۱۷ تا ۱۸۹۸) اور علامہ اقبال (۱۸۷۷ تا ۱۹۳۸) کے ادوار میں زمانی فرق تو ہے ' تاہم زمانی فرق ذہنی و فکری رشتوں کی راہ میں حائل نہیں ہوتا ' اور پھر ان دونوں کے ادوار تو ایک طرح سے ایک دوسرے سے متصل ہیں ۔ زمانے کی کئی لہریں ایک کی حد سے شروع ہو کر دوسرے کی حدود میں داخل ہوتی نظر آتی ہیں جن کی شدت میں کمی بیشی تو محسوس کی جا سکتی ہے لیکن یکسر مختلف قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے سید احمد خاں سے کسی اہم مسئلے میں کسی بڑے اختلاف رائے کا اظہار نہیں کیا ہے ۔ ہندوستان اور مسلمانوں کی حد تک جو مسائل درپیش رہے ' ان کے تعلق سے تو مقاصد ' نصب العین اور اصول و نظریے میں دونوں میں بڑی حد تک یکسانیت اور مماثلت ہے [۳۸]۔ دور حاضر کے علما ارتقا کے تسلسل کے قائل ہیں بالخصوص تاریخ کے مادی جدلیاتی تصورات اور نظریات میں طین و قت ' نسل اور زمانے کی اہمیت کے جو مارکسی فکر کے عین مطابق ہے ۔ اقبال بھی آئین نو کے قائل ہیں لیکن آفاقی نظریات جزوی تبدیلیوں کے باوجود اپنی اساس قائم رکھتے ہیں ۔ افلاطون اور ارسطو کے زمانے کے آفاقی نظریات جو کائنات کی فطرت اور انسان کی جبلت سے تعلق رکھتے ہیں ' وہ اساسی ہیں ' ان میں یکسر اور کلیتہ " تبدیلی نہیں ہو سکتی ' صرف زمانی و مکانی تغیرات واقع ہوتے رہے ' لہٰذا سید احمد اور اقبال جن کے مابین کوئی بڑا زمانی و مکانی خلا نہیں ہے ' کوئی بنیادی اختلاف کیسے ہوتا جبکہ دینی ' ثقافتی ' تہذیبی ' لسانی ' معاشی اور معاشرتی اقدار دونوں میں قریب قریب مشترک ہیں ۔

۱۸۵۷ کی ناکام جنگ آزادی کے بعد سر سید احمد خاں نے حقیقت پسندانہ نظر سے صورت حالات کا جائزہ لیا اور تمام محرکات و عوامل کا معروضی تجزیہ کیا ' اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ شکست خوردہ قوم بجائے اس کے کہ نو آبادیاتی حکمرانوں اور پست ذہنیت کی حامل ہندو قوم کے ظلم کی چکی میں پسنے کے باعث ایسی سطح پر پہنچ جائے کہ پھر عدم سے وجود میں نہ آسکے ' اس قوم کے لیے ایک ایسا ساز گار اور متوازن راستہ نکالا جائے کہ مسلم قوم کو دم لینے کی کچھ مہلت میسر آ جائے تا کہ وہ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کر کے مستقبل کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو تازہ دم کر سکے ۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے لازمی تھا کہ مصلحت پسندانہ پالیسی اپنائی جائے اور بپھرے ہوئے نو آبادیاتی حکمرانوں کے غصے کو زائل کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ سید احمد خاں نے ناگوار باتوں کو بھی حکمرانوں کے سامنے اس انداز سے پیش کیا کہ ان کے منفی پہلو حکمرانوں

کو نہ کھٹکیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی بزدلانہ اقدام نہ تھا ' بلکہ یہی وہ مثبت طریقہ تھا جس میں بغیر کسی تصادم کے جابر حاکم کے سامنے کلمہ حق کہا جا سکتا تھا ۔ اس سے پیشتر وہ ۱۸۵۷ کے تصادم کا نتیجہ دیکھ چکے تھے ' اس لیے وہ اپنی قوم کو جذباتی تصادم کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتے تھے ۔ تصادم کی فضا کو ختم کر کے سمجھوتے اور ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنا چاہتے تھے ۔ نو آبادیاتی نظام اور استعمار پسند آقاؤں نے اس زمانے میں جس قدر خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا ' اس کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو ایسے ظالم حکمرانوں کو آئینہ دکھانا ' تصادم کا ذمہ دار ٹھہرانا ' حقیقی صورت حال سے آگاہ کرنا ' بڑی شجاعت کا کام ہے ۔ رسالہ " اسباب بغاوت ہند " میں انہوں نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ جب تک عوام کو سیاسی حقوق اور حکومت میں مداخلت کا حق حاصل نہ ہو ' اس وقت تک کوئی دیرپا اور اچھی حکومت قائم نہیں ہو سکتی ۔۔ علی الخصوص ہماری گورنمنٹ کو جو غیر ملک کی رہنے والی تھی اور مذہب اور رواج اور راہ و رسم اور طبیعت اور عادات بھی اس ملک سے مختلف رکھتی تھی ۔ اس بات کا خیال رکھنا واجبات میں سے تھا [۳۹] ۔ قاضی جاوید اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی کے ہندوستان کی معروضی صورت حال میں یہ خیالات بلاشبہہ انقلابی اور نہایت ترقی پسندانہ تھے ' یہاں تک کہ سیل بیڈن ' فارن سیکرٹری حکومت ہند اور برطانیہ کے بعض اخبارات نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے باغیانہ قرار دیا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ ایسے خیالات کا اظہار کرنے والے شخص سے سختی کے ساتھ باز پرس ہونی چاہیے ۔ اس کے باوجود سید احمد خاں اپنے موقف پر ڈٹے رہے [۴۰] ۔ سید احمد خاں ایک طرف تو بہ زور حکمت اور تدبر اس حصار کو توڑ رہے تھے جو ہندوؤں اور انگریزوں نے مل کر مسلمان قوم کے گرد قائم کر رکھا تھا ' اور دوسری طرف مسلمان قوم کو شکست خوردگی کے احساس کمتری سے باہر نکال کر امید کی کرن دکھا رہے تھے کہ زوال اور انحطاط کے بعد عروج بھی حاصل ہو سکتا ہے ۔ مسلمان قوم جو جذبہ نفرت سے مغلوب ' خود کشی کی جانب گامزن تھی ' اس کی سوچ اور فکر کا قبلہ ہی درست نہیں کیا بلکہ اس قوم کے مذہب کو بھی غیر قوموں کے حملوں سے محفوظ رکھا ۔ ان کے جذبات اور احساسات کی تربیت و تہذیب کی اور ان کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کیا ' ماضی کے خسارے کو پورا کرنے کی تدبیر بتائی ' تخریب کے بجائے تعمیر کا راستہ دکھایا ' ان کو آنے والی نسلوں کے مستقبل کی طرف متوجہ کیا ۔ گویا جذبات کی نہج سے ہٹا کر فکر اور عقل کی منہاج قائم کی اور اس رویے کو اپنے مختلف تعمیری منصوبوں کے ذریعے مضبوط اور مستحکم بنایا اور حائل ہونے والی منفی قوتوں کا سد باب بڑے احسن طریقے سے کیا ۔

اقبال کا دور سید احمد خاں کے دور سے اس لحاظ سے مختلف تھا کہ اب نو آبادیاتی نظام کا اثر و رسوخ کسی قدر ماند پڑتا جا رہا تھا ' البتہ مسلمان قوم کے مسائل و معاملات کم

و بیش وہی تھے جو سید احمد خاں کے دور میں تھے ۔ سید احمد کو دہلی کالج سے فارغ التحصیل دانشوروں کی جو کھیپ میسر آئی تھی' اس نے ملک میں دانشوری کا فکری 'عقلی اور سائنسی چراغ روشن کیا تھا ۔ "محب ہند" "فوائد الناظرین" اور "قران السعدین" جیسے رسالوں نے تفکر و تعقل کے راستے سے معروضی تجزیے اور منطقی و استدلالی تحلیل کا جو راستہ بنایا تھا ' وہ سید احمد کے اور ان کے رفقا کے بہت کام آیا جس سے اسلامی نشاۃ ثانیہ کے قیام میں مدد ملی ۔ سرسید احمد کے بنائے اداروں نے اقبال کو ان کے دور میں بڑی مدد دی اور قوم کی سوچ اور فکر میں پختگی اور استواری آئی ۔ سید احمد خاں نے اپنے خاص لائحہ عمل کے تحت جو کام برصغیر میں کیا تھا ' اس کے سبب راہ اس قدر ہموار ہو چکی تھی کہ اقبال کسی شدید رد عمل کا سامنا کیے بغیر فلسفیانہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر قوم کو بصیرت و آگہی کے میدان میں ایک قدم اور آگے لے گئے 'یعنی اتحاد عالم اسلامی کی طرف ! لیکن راہ وہی تھی جس کے نشان سید احمد خاں کی فکر تک پہنچتے ہیں ۔ اقبال سید احمد خاں کے بعد قوم کی رہنمائی اسی جذبے ' خلوص اور بے باکانہ انداز سے کی جو سید احمد خاں کا خاصہ تھا کہ وہ سوتے جاگتے ہر لحہ قوم کی فکر میں لگے رہتے تھے ۔ یوں دیکھا جائے تو مقاصد اور فکر و عمل کے اعتبار سے اقبال اور سید احمد خاں ' دونوں میں بڑی حد تک مشابہت و مماثلت نظر آتی ہے ۔ اس سلسلے میں وہ خط غلط فہمی کا باعث بنتا ہے جو علامہ نے علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دیے جانے پر پروفیسر میاں شریف کو ۱۹ جنوری ۱۹۲۵ کو اس طرح لکھا :

> "علی گڑھ یونیورسٹی نے میری جو قدر افزائی کی ہے ' اس کے لیے میں ان کا نہایت شکرگزار ہوں ۔ یہ اعزاز اور بھی گراں قدر ہو جاتا ہے جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ میرا کوئی حق اس یونیورسٹی پر نہ تھا ' اور نہ عام طور پر علی گڑھ تحریک سے میرا کوئی تعلق رہا[۱۲] ۔"

لیکن غور کیا جائے تو یہاں علامہ نے علی گڑھ تحریک سے تنظیمی لاتعلقی کا اظہار کیا ہے ' ذہنی و قلبی وابستگی سے نہیں بلکہ اس خاص انداز کو اپنا کر علامہ نے یونیورسٹی کی قدر افزائی کو نمایاں کرتے ہوئے معقول طریقے سے اس کا خیر مقدم کیا ہے ۔ اس لیے اس خط کو سید احمد خاں اور علامہ اقبال کے ذہنی روابط کی نفی تصور نہیں کرنا چاہیے ۔

سید احمد خاں کی طرح اقبال نے رجعت پسندی اور تنگ نظری کے خلاف علم جہاد بلند رکھا ۔ اسلام کے حقیقی اور عملی نظریات پر زور دیا ۔ سالہا سال سے بند اجتہاد کے دروازوں کو کھول کر اسلام کو اپنے زمانے کے تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی کہ کہیں اسلام رفتہ رفتہ ہماری زندگیوں سے (عدم مطابقت کی بنا پر) خارج نہ ہو جائے ۔ تمام زندہ' متحرک اور فعال مسلمانوں کی طرح سید احمد اور اقبال ' اسلام کی

روح پر نظر رکھتے تھے اور محض ظاہری رسوم و رواج کو ملحوظ خاطر نہ رکھتے تھے ۔ اقبال کی اسلامی ما بعد الطبیعیات میں بھی سید احمد خاں کے بعض معتقدات سے خاصی مماثلت نظر آتی ہے ۔ اقبال نے بھی روح ' جنت ' دوزخ ' ملائکہ اور شیطان وغیرہ کے بارے میں جو تصورات پیش کیے ہیں ' وہ ان عقائد و مسلمات سے مختلف ہیں جو اسلاف نے پیش کیے تھے ۔ اقبال ' سید احمد خاں کی طرح اس بات کے قائل تھے کہ اسلامی تعلیمات کی تعبیر و تشریح اور تطبیق کا کام علوم حاضرہ کے تناظر میں ہونا چاہیے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ الہامی کتب حقیقت میں سائنسی صداقتوں سے متصادم نہیں ہو سکتیں ۔ اس طرح سید احمد خاں اور اقبال نے حقیقی اسلام کو ملاؤں کے اسلام سے مختلف سمجھا اور تمام معتقدات کی ' سائنسی اور عقلی منہاج پر تشریح و تطبیق کی ۔

ارتقا کا جذبہ انسان کے ضمیر میں موجود ہے اور ترقی اس کی فطرت میں داخل ہے ' لیکن ہر دور میں ایسی طاقتیں رہی ہیں جنہوں نے مستقبل کے بجائے اپنا رخ ماضی کی جانب قائم رکھا اور آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے جانے کی کوشش کی [۴۲] ۔ سید احمد خاں نے ایسی طاقتوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی جد و جہد کو انسانی ترقی اور بقا کے حصول کے لیے وقف کر دیا اور دور اندیشی ' روشن خیالی اور وسیع النظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے مقاصد کی تکمیل میں کوشاں رہے ۔ دوسری طرف اقبال نے بھی اسی طرز عمل کو اپنایا ۔ ان کے ہاں ملت اسلامیہ کی ترقی اور ماضی کے مقابلے میں مستقبل کی اہمیت کا احساس سید احمد خاں کے اثرات ہی کا نتیجہ ہے ۔ دونوں ' اہل مغرب کی افراط و تفریط کو ناپسند کرتے ہیں اور اعتدال کی راہ پر چلتے ہیں ۔ دونوں ' دو قومی نظریے پر کسی سے سمجھوتا نہیں کرتے نہ مرعوب ہوتے ہیں ۔ دونوں کے پاس مضبوط منطقی استدلال کی قوت ہے جس کی توانائی ان کی تحریروں میں جگہ جگہ نظر آتی ہے ۔

حواشی

۱ ۔ قومی زبان ' ماہنامہ ' کراچی ' نومبر ۱۹۹۳ ' ص ۱۳

۲ ۔ عابد ' سید عابد علی ' شعر اقبال ' لاہور ' بزم اقبال ' ۱۹۷۷ ' ص ۳۹

۳ ۔ صدیقی ' ڈاکٹر افتخار احمد ' عروج اقبال ' لاہور ' بزم اقبال ' ۱۹۸۷ ' ص ۱۲۸

۴ ۔ حالی ' مولانا الطاف حسین ' حیات جاوید ' لاہور ' ہجرہ انٹرنیشنل پبلشرز ' ۱۹۸۴ حصہ دوم ص ۳۲۲ ۔ ۳۲۳

۵ ۔ عطا اللہ شیخ (مرتب) اقبالنامہ (حصہ دوم) ' لاہور ' شیخ محمد اشرف ' ۱۹۵۱ ص ۱۸۰

۶ ۔ سالک ' مولانا عبدالمجید ' ذکر اقبال ' لاہور ' بزم اقبال ' ۱۹۸۳ ' ص ۲۷۷

۷ ۔ اسماعیل پانی پتی ' شیخ محمد (مرتب) ' مکتوبات سر سید ' لاہور ' مجلس ترقی ادب ' ۱۹۵۹ ص ۳۰۰ ۔ ۳۰۱

۸ ۔ معینی ' سید عبدالواحد ' محمد عبداللہ قریشی (مرتبین) ' باقیات اقبال ' اقبال ' لاہور ' آئینہ ادب ' ۱۹۶۵ ص ۴۲۹

۹ ۔ اقبال ' علامہ ڈاکٹر محمد ' کلیات اقبال اردو (بانگ درا) ' لاہور ' شیخ غلام علی اینڈ سنز ' ۱۹۷۷ ص ۹۷

۱۰ ۔ سالک ' مولانا عبدالمجید ' لکھتے ہیں کہ مولانا حالی کی " حیات جاوید " میں دونوں تاریخوں کا ذکر تھا لیکن نام کسی کا نہ لکھا تھا ۔ شاہ صاحب (علامہ سید میر حسن) نے خود خواجہ حالی کو خط لکھا اور ناموں کے درج نہ ہونے کی شکایت کی ۔ حالی نے جواب میں لکھا مجھے ناموں کا علم نہیں تھا ' آئندہ ایڈیشن میں اس فروگزاشت کی تلافی کر دی جائے گی ۔ (ذکر اقبال ' ص ۲۷۷ ۔ ۲۷۸)

۱۱ ۔ وحید الدین ' فقیر سید ' روز گار فقیر (اول) ' کراچی ' لائن آرٹ پریس ' ۱۹۶۶ ص ۱۲۶ تا ۱۲۸

۱۲ ۔ وحید الدین ' فقیر سید ' روز گار فقیر (جلد دوم) ' لاہور ' آتش فشاں پبلی کیشنز ۱۹۸۸ ص ۴۱۳

۱۳ ۔ ابتدا" یہ نظم ۳۴ اشعار پر مشتمل تھی ۔ نظر ثانی کے بعد بانگ درا میں صرف ۱۴ اشعار باقی ہیں ۔ ایک شعر اصلاح شدہ ہے اور دو شعروں کا اضافہ کیا گیا ہے ۔

۱۴ ۔ اقبال ' علامہ ڈاکٹر محمد ' کلیات اقبال اردو (بانگ درا) ص ۵۲

۱۵ ۔ ایضا"

۱۶ ۔ ایضاً

۱۷ ۔ ایضاً ص ۵۳

۱۸ ۔ معینی ' سید عبدالواحد ' محمد عبداللہ قریشی (مرتبین) باقیات اقبال ' ص ۳۰۸

۱۹ ۔ ایضاً ' ص ۳۰۹

۲۰ ۔ ایضاً ص ۳۰۷

۲۱ ۔ زکریا ' ڈاکٹر خواجہ محمد ' اقبال کا ادبی مقام ' لاہور ' مکتبہ عالیہ ' ۱۹۸۷ ص ۱۰

۲۲ ۔ زبیری ' محمد امین ' خدو خال اقبال ' کراچی ' خسروی ' ۱۹۸۶ ص ۸۴ تا ۹۰

۲۳ ۔ دسنوی ' عبدالقوی ' اقبالیات کی تلاش ' نئی دہلی ' مکتبہ جامعہ ' ۱۹۸۴ ص ۱۲۰

۲۴ ۔ زکریا ' ڈاکٹر خواجہ محمد ' اقبال کا ادبی مقام ' ص ۱۰ تا ۱۲

۲۵ ۔ اقبال ' علامہ ڈاکٹر محمد ' کلیات اقبال فارسی (پس چہ باید کرد اے اقوام شرق) لاہور ' شیخ غلام علی اینڈ سنز ' ۱۹۷۵ ص ۸۴۳

۲۶ ۔ عطا اللہ ' شیخ (مرتب) اقبال نامہ (حصہ اول) لاہور ' شیخ محمد اشرف (۱۹۴۵) ' ص ۴۱۴

۲۷ ۔ ہاشمی ' ڈاکٹر رفیع الدین (مرتب) خطوط اقبال ' لاہور ' مکتبہ خیابان ادب ' ۱۹۷۶ ص ۲۶۳

۲۸ ۔ رفیق افضل ' محمد (مرتب) ' گفتار اقبال ' لاہور ' ادارہ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب ' ۱۹۶۹ ص ۷۳

۲۹ ۔ نیازی ' سید نذیر ' اقبال کے حضور ' لاہور ' اقبال اکادمی پاکستان ' ۱۹۸۱ ص ۲۹۱ ' ۲۹۲

۳۰ ۔ ایضاً ص ۲۹۲ ' ۲۹۳

۳۱ ۔ عطا اللہ ' شیخ (مرتب) ' اقبالنامہ (حصہ دوم) ' ص ۲۱۶

۳۲ ۔ Latif Ahmad Shervani (Editor), *Speaches, Writings & Statemants of Iqbal*, Lahore, Iqbal Academy Pakistan, 1977. P.190

۳۳ ۔ نیازی ' سید نذیر ' اقبال کے حضور (جزو اول) ' ص ۲۸۵

۳۴ ۔ ڈار ' بشیر احمد (مرتب) انوار اقبال ' لاہور ' اقبال اکادمی پاکستان ' ۱۹۷۷ ص ۳۱۷

۳۵ ۔ نیازی ' سید نذیر ' اقبال کے حضور (جزو اول) ص ۲۴ ۔ ۲۶

۳۶ ۔ ایضاً ص ۲۸۵

۳۷ ۔ ایضاً ص ۶۴

۳۸ ۔ عقیل ' ڈاکٹر معین الدین ' اقبال اور جدید دنیائے اسلام ' لاہور ' مکتبہ تعمیر انسانیت ' ۱۹۸۶ ص ۱۳۳

۳۹ ۔ اسماعیل پانی پتی ' مولانا محمد (مرتب) مقالات سرسید (حصہ نہم) ' لاہور ' مجلس ترقی ادب (س ۔ ن) ص ۶۱ ' ۶۲

۳۰ ۔ قاضی جاوید 'سرسید سے اقبال تک' لاہور' نگارشات' ۱۹۸۶ ص ۲۸
۳۱ ۔ عطا اللہ' شیخ (مرتب) اقبالنامہ (حصہ دوم) ص ۲۳۳
۳۲ ۔ سلطانہ صفر (مولفہ) اقبال دور جدید کی آواز' کراچی' ادارۂ تحریر' ۱۹۷۷ ص ۱۳۴ ۔

---

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006